فلسطین کی معاصر ادبی صورتحال

عبدالحق حقانی القاسمی، ۶۹ ـ محمد حبیب ہال، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

"ایک شاعر کا سماجی منصب ماضی کی عظمتوں کا تحفظ، حال کے واقعات کی تشریح اور مستقبل کی تعمیر ہے۔ کیونکہ "ادب" بھی بنیادی طور پر ایک سماجی عمل ہے اور ہمیشہ سے ایک سماجی عمل رہا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ سماجی عمل ادب کے وجود میں، اس کے مزاج میں، اس کے خون میں شامل ہے، اور یہی اس کا بنیادی رشتہ ہے۔ اس رشتہ کی وجہ سے ادب انسان کے سماجی رشتوں کا سب سے اہم مظہر بنتا کر قوم کی روح کے اظہار کا سب سے بڑا وسیلہ بن جاتا ہے۔" [1]

اس سلسلے میں ٹی۔ ایس ایلیٹ کا خیال بہت صحیح ہے کہ ا

"شاعر کے (بحیثیت شاعر) فرائض قوم سے بالواسطہ ہوتے ہیں، اس کا براہ راست فرض تو اس کی زبان سے ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ اسے محفوظ رکھے۔ دوسرے یہ کہ اسے آگے بڑھائے اور ترقی دے، اس بات کے اظہار سے کہ دوسرے لوگ کیا محسوس کر رہے ہیں، اور زیادہ باخبر کر دیتا ہے اور اس طرح انہیں ان کی ذات سے بھی زیادہ باخبر کر دیتا ہے لیکن صرف یہی نہیں کہ وہ دوسروں کے مقابلے میں زیادہ باخبر کر دیتا ہے وہ انفرادی طور پر دوسرے لوگوں حتیٰ کہ دوسرے شاعروں سے بھی مختلف ہوتا ہے اور شعوری طور پر اپنے پڑھنے والوں کو ان احساسات سے روشناس کرا دیتا ہے جو

---

[1] جمیل جالبی، نئی تنقید (دہلی: ۱۹۸۸) ص ۲۷۴ ۔

اس سے پہلے ان کے تجربے میں نہیں آئے تھے" ۲؎

ان خیالات کی روشنی میں دیکھا جائے تو شاعر کبھی بھی سیاسی و سماجی حالات سے بے خبر نہیں رہ سکتا اور وہ کسی نہ کسی طور پر سیاست سے ضرور متعلق ہوتا ہے اور اس نوع کی نظمیں بھی لکھتا ہے، ادب اور سیاست کے باہمی ربط کے سلسلے میں دو گروہ میں ایک گروہ نے ایسی شاعری کو بے اثر قرار دیا ہے جس کے تحت سیاست کی بات کی جائے۔ جبکہ دوسرے طبقے نے ہر چیز کو سیاسی قرار دیا ہے۔ ایک طبقے کی نظر میں گویا ادب اور سیاست آپس میں مستحکم طور پر مربوط ہیں۔ قدیم زمانے میں افلاطون نے شاعری اور سیاست پر زور ڈالتے ہوئے اپنے زمانے کے شاعروں کو روایتی اور سماجی اقدار کا حامل اور زندہ افسانوں کا محافظ قرار دیا ہے، انہوں نے خود بھی شعری زبان استعمال کی۔ اس لئے سیاست کی شاعری سے علیحدگی کلی طور پر ممکن نہیں ہے۔ دانتے (Dante) کا شاہکار Divine comedy دراصل سماجی اور سیاسی حالات کی شعری داستان ہے۔

شاعری اور سیاست کے درمیان تفریق و امتیاز کی ذمہ داری ارسطو پر ہے جس نے تاریخی صداقت کو شاعرانہ حقیقت سے الگ قرار دیا اس نے یہ لکھا کہ

"میں یہ واضح طور پر کہنا چاہوں گا کہ شاعر کا یہ منصب نہیں ہے کہ وہ اس کی وضاحت کرے کہ کیا حقیقت میں ظہور پذیر ہوا ہے، بلکہ اس طرح کی چیزیں جو ہو سکتی ہیں یا جن کے ہونے کے امکانات ہوں اس کی وضاحت کرنا ہی اس کا منصب ہے۔"

ارسطو کے اس نظریہ کے باوجود بھی اس حقیقت سے انکار اب ممکن نہیں کہ سیاسی شاعری اپنا علیحدہ وجود رکھتی ہے، اور ایک صنف کی حیثیت سے نشو و نما پا رہی ہے اس لئے نہ تو اس کے وجود کو ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسکی ادبیت کا انکار ممکن ہے ۳؎

۲؎ جمیل جالبی، ایلیٹ کے مضامین (دہلی ۱۹۷۸ء) ص: ۸۷ ۔

۳؎ Ferial Ghazoul "The Poetics of the Political Poem" Arab Studies Quarterly V.8 No.2 Spring 1986

قدیم عرب شعری روایت میں بھی شاعروں نے اپنے قبیلے کے سماجی، سیاسی کوائف کی ترجمانی کی ہے۔ اس دور کے شعراء نہ صرف جمالیاتی اقدار کے محافظ تھے بلکہ انکی سیاسی و قبائلی شعور کے بھی پاسبان تھے۔ معاصر قومی عرب شاعری بھی اسی روایت کا ایک تسلسل ہے جو مختلف ادوار میں مختلف تجربوں سے گزر رہی ہے، اور فلسطین کی مزاحمتی شاعری اس میں ایک نمایاں اہمیت کا حامل ہے۔

(۲)

عربوں کی ثقافتی روایت میں شاعری کی ایک امتیازی حیثیت رہی ہے قدیم عربوں نے اپنے جذبات کا مکمل اظہار شاعری کے ذریعہ ہی کیا ہے۔ چونکہ فلسطین بھی عرب ثقافت اور قومی تشکیل کا ایک حصہ ہے۔ اس لئے وہاں کے شاعروں نے بھی شاعری کو عرب تشخص کے اظہار کا ذریعہ بنایا اور اس صنف میں اپنے جذبات، احساسات اور تجربے کو پیش کیا۔

قیام اسرائیل (۱۹۴۸ء) کے قبل برطانوی انتداب کے دوران بھی شاعروں نے برطانوی اقتدار اور صہیونی استعمار کے خلاف اپنے جذبۂ بغاوت، غصہ و غم کا اظہار شاعری کے ذریعے کیا۔

قیام اسرائیل فلسطینی ادب کے لیے ایک نقطۂ انقلاب ہے۔ عرب ثقافت کے خلاف اسرائیل حکومت نے منظم پالیسی کے تحت شاعروں اور ادیبوں کے لئے اپنے جذبات کا کھلے طور پر اظہار کرنا ممنوع قرار دیدیا تھا۔ اندرونِ اسرائیل عرب فلسطین کو طاقت و قوت کی بنیاد پر بقیہ عرب دنیا سے رشتہ توڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ مگر چونکہ ان میں وطن سے محبت اور تعلق کا جذبہ تھا۔ اس لئے فلسطینی مزاحمتی شاعری وجود میں آئی۔ جو کہ ۱۹۴۸ء کی پسپائی اور قیام اسرائیل کا ردعمل تھی جس میں عربوں کے سیاسی اور قومی تشخص کے استیصال کے لئے قومی جبر و تشدد کے عمل کو صہیونیوں نے روا رکھا تھا۔ مزاحمتی شاعری کی تحریک پوری عرب دنیا میں ادب کی "خود آگہی کی ہیئت" کی

حیثیت سے ابھرنے لگی۔ اس تحریک کو توفیق زیاد، سالم جبران، محمود درویش، اور سمیح القاسم نے فروغ دیا۔ اور انتہائی مشکل حالات میں ان لوگوں نے قومی ایقان اور علانیہ نافرمانی و بغاوت کے جذبات کے ذریعہ جمالیاتی احساس کی تشکیل کی۔ انہی لوگوں نے التزامی شاعری commited poetry کی متحرک لہر کی بنیاد ڈالی، اور نئی شعری رویوں کے لئے نئی بنیادیں فراہم کیں [۴]

جب عرب دنیا نے محمود درویش، سمیح القاسم اور توفیق زیاد کی آوازیں سنیں تو انہیں حیرت کے ساتھ خوشی بھی ہوئی کیونکہ یہ اس بات کی علامت تھی فلسطین اب بھی عرب ہے اور عرب دل کی دھڑکنیں ابھی رکی نہیں ہیں۔

ان مزاحمتی شاعروں کے اندر عربیت کا احساس تھا، ان لوگوں نے کلاسیکی عربی میں شعر کہے تاہم ان کی مزاحمتی شاعری علاقائی اور مقامی لوک گیتوں سے متأثر ہے توفیق زیاد نے فلسطینی لوک گیتوں کا ایک مجموعہ شائع کیا، اور بہت سے مزاحمتی شاعروں نے فلسطینی علاقائی لہجے سے الفاظ، جملے اور تمثال مستعار لئے، پھر بھی کلاسیکی عربی شاعری ایک مدت تک عام تاریخی تجربے اور وحدت کی مشترک زبان رہی، کیونکہ یہی منتشر قوم کو باہم مربوط کرنے اور حال ماضی اور مستقبل سے رشتہ جوڑنے کا ایک ذریعہ تھی۔

(۳)

۱۹۴۸ء کے بعد مختلف حادثات و واقعات رونما ہوئے، جن کے جدید شاعری کے تصور، نظریہ اور ترقی پر گہرے اثرات ہیں۔ ان حادثات میں مصری انقلاب

---

۴ Abdelwahah M. Elmessiri "The Palestinian wedding." Journal of Palestine Studies (Washington) V.10. No.3, 1981, pp.77-99.

Ibid.

(۱۹۵۵ء) حادثۂ کفر قاسم (۱۹۵۶ء) اور عرب اسرائیل جنگ (۱۹۶۷ء) نمایاں طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کی وجہ سے مختلف عرب ریاستوں میں ناگہانی تغیر و انقلاب پیدا ہوا اور اس کے علمی و ادبی زندگی پر گہرے اثرات پڑے۔

اسی دوران جدیدیت کا رجحان عام ہوا اور اس سے متعلق شعراء کلاسیکی ہیئت یا روایت کو قطعی طور پر برداشت کرنے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ خود کو اپنے زمانے کے حالات اور مسائل سے متعلق کرنا چاہتے تھے، فلسطینی قضیے نے انہیں ایک ثبوت اور شہادت مہیا کی، اور یہ لوگ عرب دنیا میں بغاوت اور ناراضگی کے جذبات کا اظہار کرنے لگے اور شاعر اور فنکار کے دل میں معاصر عرب وجود سے اجنبیت کا احساس پیدا ہوا انہیں اپنا حال خالی اور بے کیف سا محسوس ہونے لگا۔ تو انہوں نے پرانی دنیا کے مردہ ماضی سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور نئے عرب فن کاروں نے دوسری تہذیبوں اور نئے اقدار، جدید انداز فکر سے استفادہ کیا اور روایتی تخیل کی محدود فضاؤں ـــــ سے ماوراء بھی شاعری میں نئے تجربے کئے۔ نئی زبان اور جدید ہیئت استعمال کی جو کہ حرکی اور مستقبل سے مربوط ہے کمال ناصر (۱۹۲۵ء ۱۹۷۳ء) نے "مونا لیزا" میں نہ صرف مخصوص ہیئت کے خلاف بغاوت کی بلکہ عمومی ہیئت کے خلاف بھی۔ ؎۵

مذکورہ بالا حادثوں میں سے دو حادثے خاص طور پر فلسطین سے متعلق ہیں اس لئے ان کے اثرات اور بھی زیادہ گہرے ہیں۔ کفر قاسم کا حادثہ جو صیہونی تشدد و انتہا پسندی کا ایک نمونہ ہے اس کا بنیادی مقصد عربوں کے دلوں میں خوف و دہشت پیدا کرنا تھا اس میں ہزاروں فلسطینی قتل ہوئے تھے۔ یہ حادثہ اس قدر سخت اور جان لیوا تھا کہ ایک یہودی شاعر "فتان الترمان" نے اس سے متعلق ایک قصیدہ

؎۵ Abdelwahab M. Elmessiri "The Palestinian Wedding" Journal of Palestine studies (Washington) Vol. 10 No. 2, 1981, pp. 77-99.

لکھا، اور اس واقعہ کی سخت لہجہ میں مذمت کی۔

مقبوضہ سرزمین کے عرب شاعروں نے بھی اس کے متعلق نظمیں لکھیں جن میں سالم جبران، فدوی طوقان، ابراہیم اور محمود درویش کی دردناک نظمیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ محمود درویش کی دو نظمیں "ازھار الدم" اور "القتیل رقم ۱۸" اسی المیے سے متعلق ہیں۔ موخر الذکر نظم میں شاعر نے یہ کہا کہ شاخ زیتون کا ہرا پن اور آسمان کی نیل گونی اب ماضی کا فسانہ بن کر رہ گئی ہے، اس نظم میں بہیمانہ قتل عام پر گہرے دکھ کا اظہار کیا گیا ہے اس کے چند شعر یوں ہیں۔

کانَ قلبی مرۃً عصفورۃ زرقاء

یا حبیبی عندی کلہا بیضاء

جون ۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ کا بھی عرب شاعری پر بہت گہرا اثر پڑا اور عربوں کی اس پسپائی نے ایک طبقے میں مایوسی اور کلبیت کی کیفیت پیدا کر دی اس سے متأثر ہو کر بعض شاعروں نے انتہائی جذباتی نظمیں لکھیں، اور موجودہ عرب ثقافت کو بدلنے پر زور دیا، ان میں نزار قبانی کی نظم "ھوامش علی دفتر النکسۃ" کو خاص مقبولیت اور شہرت ملی، مگر یہ نظم تمام عرب دنیا میں ممنوع قرار دی گئی۔ اس نظم کے چند شعر اس طرح ہیں۔

انعی لکم یا اصدقاء اللغۃ القدیمۃ

والکتب القدیمۃ

انعی لکم

کلامنا المثقوب کالاحذیۃ القدیمۃ

لست عبیداً قذرا

کما یقول مخبروکم سادتی الکرام

الصلوات الخمس لا انقطعی،

وخطبۃ الجمعۃ لا۔

وغیر شدی زوجتی لا اعرف الحرام
من ربع قرن وانا
امارس الرکوع والسجود ؎٦
اس طرح عبدالوہاب البیاتی نے بھی ایک نظم " بکائیۃ الی شمس حزیران" کے عنوان سے لکھی جس کے چند شعر یوں ہیں!
نحن جیل الموت بالمجان، جیل الصدقات ۔
لم نمت یوما، ولم نولد، ولم نعرف عذاب الشہداء
فلماذا ترکونا فی العراء
یاالہی، للطیور الجارحات
نرتدی اسمال موتانا، ونبکی فی حیاء
آہ، لم نترک علی عورتنا، شمس حزیران رداء. ؎۷
فلسطینی مزاحمتی شاعری اس جنگ میں پسپائی کے باوجود بھی حیرت انگیز طور پر مستقبل سے پرامید ہے۔ محمود درویش اور سمیع القاسم کے ہاں تو مستقبل کی طرف دیکھنے کا ایک جراتمندانہ رویہ ملتا ہے۔ ؎۸
سمیع القاسم نے ۵ رجون ۱۹۶۷ء کے متعلق یوں کہا!
نحن، فی الخامس
فی شہر حزیران،
ولدنا مرۃ جدید
سمیع القاسم کی طرح محمود درویش نے ۵ رجون ۱۹۶۷ء کے بارے میں رجائیت

؎٦ احمد سلیمان الاحمد، الشعر العربی والقضیۃ الفلسطینیہ (دمشق: ۱۹۷۳) ص ۹۷
؎۷ امجد اسلام امجد "عکس" (لاہور) مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶
؎۸ " " " " " " " " "

بجرہن

پسندانہ شعر کہے

ولیکن

لابدلی

لابد للشاعر من نخب جدید

واناشید جدیدہ

اس جنگ نے تو محمود درویش کے حوصلے اور بڑھا دیئے اور جدوجہد پر ان کا یقین اور گہرا ہوتا گیا۔

۴

فلسطینی مزاحمتی شاعری میں فلسطین (مادرِ وطن) سے حد درجہ تعلق اور شدت محبت کا اظہار ملتا ہے یہ اسی شاعری کا اہم مرکزی خیال ہے۔ عرب دنیا کے اس خاص مقام سے اپنی وابستگی اکثر شاعروں نے ظاہر کی۔ محمود درویش کی نظم "عن الامنیہ" بھی دراصل اسی تخصیص پسندی (particularism) کی ایک واضح یقین دہانی ہے اس تخصیص پسندی یا آزاد و فاقیت کا خیال فوزی الاسمر، راشد حسین کے یہاں بھی ملتا ہے۔ ان شاعروں کی فلسطینی اشیاء سے محبت بھی تخصیص پسندی کو واضح کرتی ہے چنانچہ فلسطینی شاعری میں بار بار شاخِ زیتون، نارنگی، یاسمین اور دیگر فطری مناظر کے حوالے ملتے ہیں۔

فلسطین ان کے نزدیک ایک محبوب ہے اور یہی محبوب انہیں جذبات کی زبان عطا کرتا ہے۔ اس کی وجہ سے شاعر اور محبوب کے درمیان کے فاصلے ختم ہوتے ہیں راشد حسین اپنی نظم "سیجارۃ" میں اپنی شدتِ محبت کا اظہار یوں کرتے ہیں کہ سگریٹ کے عادی ہونے کے باوجود بھی وہ صرف فلسطین کی خاطر زندہ رہنا چاہتے ہیں جب کہ وہ سگریٹ اور اس کے دھواں کو لاشیئت کی علامت قرار دیتے ہیں۔ آخر میں وہ گویا اپنی سگریٹوں سے لگی آگ کے دھواں سے مرجاتے ہیں۔[9]

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

...ہی ایک نظم "ساعتہ الصفر" میں راشد حسین خود کو مادر وطن کی ہئیت کا عکس قرار دیتے ہیں۔ اور ان کے برادرِ خورد احمد حسین کو بھی یہ احساس ہے کہ باوجودیکہ وہ شاعر ہیں اور فلسطین کے لیے اپنی محبت کا نغمہ گاتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ خود نغمہ (گیت) بن جاتے ہیں جب فلسطین (مادر وطن) سنتی ہے۔ اس میں شاعر نے ایک خوبصورت فضا پیدا کر دی ہے اس طور پر کہ مرکزی خیال سامع اور نغمہ نگار ایک گیت بن جاتا ہے۔ شاعر نغمہ اور مادر وطن کے درمیان کی سرحدیں اور دیواریں ٹوٹ جانے کے بعد ایک پیچیدہ امیجری جنم لیتی ہے۔ جو محمود درویش کی نظم "عاشق من فلسطین" کو بھی مشخص کرتی ہے کہ اس کا آغاز شکستہ آئینہ کی تمثال کے ساتھ ہوتا ہے اور پھر آوازوں کی کرچیوں کے جمع کرنے کے بعد شاعر بربط کے دل میں ان کا پودا لگاتا ہے بعد میں فلسطین اس کے لب پر ایک آواز بن جاتی ہے اور اس وقت اس سے کہتی ہے کہ اس سے ایسے کی کتاب کی ایک نظم کی طرح پڑھے اور شاعر اسے اپنی ڈائری میں رکھ لیتا ہے کہ یہ اس کی نظموں کے لیے آگ اور زادِ راہ کی طرح ہے اس سے فلسطینی شاعری کے عالمی بعد کا بھی اندازہ ہوتا ہے ؁

معاصر فلسطینی مزاحمتی شاعری کا ایک مرکزی خیال "رثائی لہجہ" ہے جس میں شاعروں نے دیریاسین اور کفر قاسم جیسے عظیم انسانی المیے کو شعری زبان عطا کی ہے۔ اسی طرح صمود (استقلال اور استحکام) بھی اس کا ایک مرکزی خیال ہے جس کا اظہار چٹان، مٹی اور زمین کے حوالوں سے ہوتا ہے، محمود درویش کی نظم "ابی" اس کی نمائندہ مثال ہے

۹؎ Abdelwahab M. Elmessiri "The Palestinian wedding" Journal of Palestine studies (Washington) V.10 No.3, 1981, pp. 77-99.

۱۰؎ Abdelwahab 'M. Elmessiri "The Palestinian wedding" Journal of Palestine studies (Washington) V.10 No.3, 1981, pp.77-99.

Ibid.

فلسطینی شاعری کا غالب انداز فکر علانیہ بغاوت کا ہے اور بسا اوقات اس میں تلخی کے ساتھ رنج وغم کا بھی امتزاج ہوتا ہے، توفیق زیاد کی نظمیں اس بغاوت کی نمائندہ مثال ہیں، ۱۹۶۰ء کی شاعری میں بھی شجاعت کے ساتھ المیہ کا لہجہ ملتا ہے۔ مختلف نظموں میں تشخص کا جذبہ ان شاعروں کو اندرونی قوت عطا کرتا ہے جو کہ آندھیوں کے رتھ میں ایک طاقت بن کر ابھرتا ہے۔ المیہ سے دوچار شاعروں کو جب وجود کے نیست و نابود کی دھمکی دی جاتی ہے تو ان کے اندر خود شعوری کے جذبے کے ساتھ موت سے مختلف ایک حقیقی وجود کا احساس ہوتا ہے۔

طنزیاتی طور پر جسمانی موت ان کے نزدیک معنی خیز وجود حاصل کرنے کا واحد ذریعہ ہے۔

(۵)

مزاحمتی شاعری میں بکثرت علامات و اساطیر ملتے ہیں۔ ان شاعروں نے مثال تجربے اور اساطیری افراد کی تجسیم اپنی شاعری میں کی ہے۔ سالم جبران خود کو عبرانی روایات کے درمیان بائبلی شمشون کی طرح دیکھتے ہیں جو کہ تاریکی، فاقہ اور محرومی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اور ایک عبادت گاہ تباہ کرنے کی کوشش میں اس پر فرد جرم عائد کیا جاتا ہے ایوب (Job) بھی بائبلی مثالی کردار ہے جو مشقتیں برداشت کرنے کا عادی ہے۔ اسی طرح کلاسیکی روایت نے بھی مزاحمتی شاعروں کو کچھ کردار اور شخصیات عطا کی ہیں۔ مثال کے طور پر "نیوبیہ" (Niobe) جسے سمیح القاسم نے اپنی نظم "نیوبیہ کا آخری لڑکا" میں استعمال کیا ہے جو اپنے بچوں کی جدائی کے غم میں روتے روتے پتھر بن جاتی ہے، سمیح کے خیال میں فلسطینی تناظر میں نیوبیہ کا آخری لڑکا مرا نہیں ہے، وہ زخم خوردہ ہے مگر اپنی ماں، بہنوں اور بھائیوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا بدلہ ضرور لے گا۔ اور ان کے آنسوؤں کو پوچھے گا۔ اسی طرح قیامت اور تجدید شباب کو بھی بطور علامت استعمال کیا گیا ہے دور نو کا شاعری میں خاصا اظہار ملتا ہے۔ فلسطینیوں کی گردش زدگی wanderings اور تشخص کے جد وجہد کے اظہار کے لئے odysses کی سیاحت زدگی اور Panelope کے مریضانہ

تمل کا بطور خاص استعمال ہوا ہے۔ "تموز" جیسے اسطور کا بھی عربی شاعری میں ذکر ملتا ہے۔ خصوصاً بدر الشاکر السیاب نے اسی کا استعمال اپنی مشہور نظم "انشودۃ المطر" میں کیا ہے۔ تموزیین شاعروں نے بھی نئی نسل کے درمیان رجائی رجحان پیدا کیا ہے[۱۱] کچھ شاعروں نے سسی فس[۱۲] اور پرومیتھیوس[۱۳] (Prometheus) کو علامت کے طور اپنی شاعری میں جگہ دی ہے۔ جن میں مؤخر الذکر کردار انسانیت کے لئے دیوتاؤں سے آگ چرا کر لاتا ہے۔ یہ غلامی سے آزادی کے راستے تک جانے کا ایک تصور دیتا ہے۔

محمود درویش نے "صلیب" کی علامت کا خاص طور پر استعمال کیا ہے۔ سمیح قاسم نے ایلیا جیسے مثالی کردار کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے جو یہودیوں کا نبی ہے اور فرقہ پرستی کے خلاف جہاد کرتا ہے۔ محمود درویش نے بھی "حبقوق" کے مثالی کردار کا اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے جو کہ یہودیوں کا نبی ہوتے ہوئے یہودیوں کی غلطیوں کے خلاف جہاد اور جنگ پر کمربستہ تھا[۱۴]

(۶)

فلسطینی شاعری کا اسلوب حد درجہ سادہ اور سہل ہے۔ ۱۹۶۰ء کے بعد خصوصاً بیزن

---

[۱۱] Salma K. Jayyusi "The contemporary Arabic Poetry" in R.C.Ostle (ed), Studies in Modern Arabic Literature (England, 1975) p. [illegible]

[۱۲] سسی فس (سیزیف) ارسطور کا استعمال عرب شاعروں نے کثرت سے کیا ہے۔ ادونیس اپنی نظم "الی سیزیف" میں کہتے ہیں۔ اقسمت ان اظل مع سیزیف / اخضع للحمّٰی وللشرار" السیاب نے بھی اپنی ایک نظم میں اس ارسطور کا استعمال کیا ہے: "سیزیف القی عنہ عبء الدھور / واستقبل الشمس علی الاطلس"

[۱۳] پرومیتھیوس کا استعمال شیلی اور گوئٹے نے کیا ہے عرب شاعروں نے گو کہ اس پر باضابطہ نہیں لکھی ہے مگر اسکے مفہوم کو اپنی شاعری میں استعمال کیا ہے دیکھئے: جلیل کمال الدین الشعر العربی الحدیث وروح العصر

[۱۴] رجاء النقاش، شاعر الارض المحتلہ

واندرون فلسطین شاعروں کا ایک مشترکہ رویہ "سہل اظہار بیان" کا تھا اس زمانے میں قدیم ہیئت ترکیب الفاظ کے خلاف بغاوت ہوئی اور قدیم شاعری کے پرشکوہ اسلوب سے نجات حاصل کرکے زیادہ جامع اور واضح زبان استعمال ہونے لگی اور شاعروں نے عام لوگوں تک اپنا پیغام پہونچانے کی غرض سے روایتی ہیئت اور خیال کو مسترد کیا، آسان وسہل انداز میں انقلابی انداز فکر اختیار کرتے ہوئے ابہام، پیچیدگی اور حاکم طبقے (Bourgeois) کے سرپرستانہ رویے کو ختم کرتے ہوئے اس ذریعۂ اظہار کو بہتر سمجھا جو طبقہ اشرافیہ کے بجائے انقلابی شاعری کے مخاطب کسان اور مزدور بھی ہیں۔ ان لوگوں نے مخفی (Esoteric) اور انفرادیت پسندانہ اظہار سے گریز کرتے ہوئے اجتماعی شعور وادراک کے رویے کو برقرار رکھا اور عوام کو واضح اور بلند منشور عطا کیا تاکہ شاعری معنی خیز اور عوامی ہوسکے۔ [۱۵]

۷

فلسطینی مزاحمتی شاعری عالمی ادبی روایات اور شعری تجربے سے متأثر ہے اس میں نئے اور تجرباتی رویّے، اساطیر، علامات اور شعری فارمولے مغربی انداز کے ہیں کیونکہ مشرقی یورپی اور انقلابی شاعری فلسطینی معاشرے میں صد درجہ معتبر تھی۔ ۱۹۶۰ء کے اخیر میں ایک وسیع تر شعری آگہی ان میں پیدا ہوئی اور شعری احیار کے نئے طریقے ایجاد ہوئے' ایلیٹ اور ایذرا پاونڈ کی تمثال پسند شعراء پر تنقیدی کاموں سے فلسطینی شاعروں نے "تخیل" حاصل کیا۔ اور ایٹس (W.B.Yeats) کے تصور اور علامت نے مزید نئے افق پیدا کئے۔ یہ شاعری معاصر تاریخی وادبی مغربی تحریکوں سے متأثر ہوئی اور اس تأثر نے فلسطینی شاعری میں ایک حرکی اور فعال تحریک پیدا کی۔ ان شاعروں نے آفاقی تصور کو اختیار کیا۔ اور انفرادی تجربوں کی محدودیت کو مسترد کردیا۔ اس لئے

۱۵ـ Mikhail Ashraw, The contempor?ry Literature of Palestine, University of virginia, 1982 p. 18.

فلسطینی شاعری عالمی انقلابی ادب میں ایک خاص مقام رکھتی ہے کہ ان کے لئے نہ ان کا لہجہ غیر مانوس ہے اور نہ ہی الفاظ و تصورات۔[16]

(۸)

فلسطینی مزاحمتی شاعری انقلابی اور انسان پرستی کی شاعری ہے۔ اس لئے کہ استحصالی طاقتوں کے خلاف جدوجہد ہی اس کا بنیادی منشور ہے۔ یہاں کے شاعروں کی نگاہ صرف اپنی سرزمین تک محدود نہیں ہے بلکہ پوری دنیا میں ہوتے والے مظالم پر ان کی نظر ہے اور وہ دنیا کے مظلوموں اور مقہوروں کے لئے بھی آوازیں بلند کرتے ہیں۔ چنانچہ فلسطین کے بیشتر شاعروں نے افریقہ، لاطینی امریکہ، کیوبا، ویتنام میں ہونے والے استعماری جبر و تشدد کے خلاف آوازیں اٹھائیں۔ اور ظلم کی چکی میں پسنے والے عوامی جدوجہد کی تائید کی۔ ان شاعروں نے مذہب و نسل، رنگ کے امتیاز کے بغیر ظلم و جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ یہودیوں کی طرح کوئی جنگجو وطن پرست Chauvinist نہیں ہے۔ ان کی شاعری کا بنیادی مقصد اپنے وطن کی طرف مراجعت، اور اپنے وجود کا تحفظ ہے۔ کیونکہ یہ وطن سرزمین فلسطین صرف مٹی نہیں بلکہ ان کی پہچان ہے۔ اور یہ ان کی سوچ اور حوصلے سے جڑی ہوئی ہے۔[17] گویا ان کے ہاں ایک جامع انسانی تصور ملتا ہے۔ اور یہ اشتراکیت سے تاثر کا نتیجہ ہے، جو کہ انسان اور سماج کی مشکلات کے سمجھنے میں بھی معاون ہے، اور ظلم و استبداد کے خلاف معاصر انسانی آواز کو قوت بہم بھی پہنچاتی ہے۔ اس لئے فلسطینی مزاحمتی شاعری کے بارے میں یہ کہنا صحیح ہے کہ فلسطین ان کے ہاں صرف ایک علاقہ نہیں ہے۔ بلکہ انسانی جدوجہد کا ایک میدان کارزار ہے۔

---

[16] Mikhail Ashrawi, The Contemporary Literature of Palestine, p. 16.

[17] رادھا رمن اگروال، موت ان کے لئے نہیں (ہندی)، الہ آباد، ۱۹۹۱ ص ۱۱۵ - ۱۲۹

جہاں مذہبی امتیاز کے بغیر تمام شعراء ظلم و جبر و تشدد کے خلاف بغاوت کا علم اٹھائے ہوئے ہیں کہ ادیب کا بنیادی مقصد ہی یہی ہے [18]

---

[18] Abdel Wahab Elmessiri, "The Palestinian Wedding," J.P.S., V.10 No.3, 1981 .

بقیہ : تبصرہ

امتیازات واشگاف کئے ہیں :"

علامہ جاحظ عربی زبان وادب کے ان اساطین اربعہ میں ہیں جن کی تحقیقات نے عربی ادب کو ہر دور میں نہ صرف سہارا دیا ہے بلکہ اس کی بنیادوں کو استوار، لب ولہجہ کو زرنگار اور اسلوب و آہنگ کو لالہ زار بنا دیا ہے۔ یہ ان کا دل آویز تذکرہ ہے۔

پوری کتاب مستند ماٰخذ پر مبنی اور فکر و تحقیق کا اچھا شاہکار ہے کہیں کہیں زبان میں ژولیدگی طرز ادا میں پیچیدگی در آئی ہے خداوند قدوس مصنف کے قلم کو باغ و بہار بنائے اور مثبت و مفید انداز تحقیق و تفتیش کی توفیق و توانائی بخشے اردو داں اہل علم طبقہ کے لئے یہ بے بہا تحفہ ہے۔